برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں

صوفیائے کرام کا حصہ

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلّی
ایم اے، پی ایچ ڈی
ریڈر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

برصغیر کے ممتاز و مقبول سلسلہ تصوّف کے عہد زرین کے مشائخ نے جو ہندوستان میں تصوف کے اساطین کا درجہ رکھتے ہیں اسلام کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں کوئی عملی جد وجہد نہیں کی، اور یہ کام اُنکے پروگرام اور ترجیحات میں شامل نہ تھا۔ (ڈاکٹر محمد حبیب علیگڈھ یونیورسٹی)

ناشر
انجمن تحفظ ناموسِ صحابہؓ مسجد فراش مومن پورہ گلبرگہ

مقالہ

برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں

صوفیائے کرام کا حصہ

مقالہ نگار

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

ریڈر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

یہ تحقیقی مقالہ سہ ماہی رسالہ "تحقیقات اسلامی" علیگڈھ میں

جولائی، اگسٹ ستمبر ۱۹۸۵ء

میں شائع ہوچکا ہے

قیمت

ناشر:-

انجمن تحفظ ناموس صحابہؓ مومن پورہ

گلبرگہ - ۲ (کرناٹک)

(بشکریہ دفائی و ڈاکٹر بخاری)

تعداد (۱۰۰)

تحقیق و تنقید

برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت میں صوفیاء کرام کا حصہ

ایک جائزہ

ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی

اسلام اقصاء عالم میں کیسے پھیلا اور اس کی عدیم المثال تیز رفتار اشاعت کے پیچھے کن اسباب و عوامل کی کارفرمائی تھی؟ بنیادی سبب خود اس مذہب کی بے اندازہ کشش، فطرت سلیم سے ہم آہنگی، انسانیت کو درپیش مسائل کو حل کر سکنے کی صلاحیت اور اس کی تعلیمات خصوصاً توحید اور انسانی اخوت و مساوات کی جاذبیت، نیز اس کے ماننے والوں کے اعلیٰ اخلاق، بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت تھی جس سے متاثر ہو کر بے شمار خلق خدا اسلام کی لازوال برکتوں سے مالا مال ہوئی، یا پھر یہ غیر معمولی کامیابی دباؤ اور طاقت کے استعمال سے حاصل کی گئی؟ یہ سوال ایک زمانہ سے موضوع بحث بنا ہوا ہے اور اس سلسلہ میں بڑی متضاد رائیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ یورپ کی سیاسی بالادستی کے بعد جس فکری یلغار کا سامنا ملت اسلامیہ کو کرنا پڑا اس کا ایک اہم ہدف یہ مسئلہ بھی تھا۔ یہ تاثر عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ اسلام کی توسیع کے پیچھے بنیادی سبب طاقت کا استعمال اور حکومت کا جبر تھا۔ مسلمان جدھر سے گزرے ان کے جلو میں وحشت و بربریت اور قتل و غارتگری کا ایک سیل بے اماں تھا جس نے اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی ہولناکیوں کے سوا کچھ نہ چھوڑا، ایک جوئے خون تھی جو انسانیت کے سر سے گزر گئی اور جس میں تہذیب و تمدن کے تمام نشان غرقاب ہو گئے، محکوم اقوام کو بزور شمشیر نئے مذہب کو اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا اور جس نے بھی انکار کی جرأت کی اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ خوں ریزی اور خون آشامی کی اس داستان کو اتنا دہرایا گیا کہ یہ افسانہ جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔[1]

اس بحث میں ایک نئے عنصر کا اضافہ اس وقت ہوا جب انیسویں صدی کے ربع آخر میں پروفیسر آرنلڈ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' شائع کی۔ اس کتاب میں انھوں نے اسلام کی توسیع و اشاعت کے مسئلہ کو تحقیق و جستجو کا موضوع بنایا تھا اور مختلف ممالک میں تاریخ اشاعت اسلام کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں طاقت اور دباؤ کا استعمال تاریخ میں بالکل ہی

غیر معروف تو نہیں رہا ہے[۳۳] لیکن اس کی مثالیں بہت کم ہیں اور عموماً یہ کام پر امن ذرائع سے انجام پایا ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کے طویل عہدِ حکومت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو توسیعِ اسلام کے لیے جبر کی مثالیں اتنی کم ہیں کہ ان کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا علمی نقطۂ نظر سے نامناسب اور گمراہ کن ہوگا۔[۳۴]

سوال یہ ہے کہ اگر برصغیر میں اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں جبر کا عنصر ناقابلِ لحاظ حد تک کم رہا تو وہ کیا اسباب و عوامل تھے جن کے باعث اس خطۂ ارض میں اشاعتِ اسلام کی راہ ہموار ہوئی اور وہ کون لوگ تھے جن کی تبلیغی مساعی یہاں کے باشندوں کو اسلامی تعلیمات سے متعارف کرانے اور انھیں اسلام سے قریب لانے کا ذریعہ بنیں۔ اس باب میں عام تاثر یہ ہے کہ برصغیر میں اشاعت اسلام کا عظیم کارنامہ صوفیاء کرام کی حسنات میں داخل ہے اور انھیں کی مساعی جمیلہ کا مرہون منت ہے۔ اس نقطہ نظر کو سب سے پہلے بہت پرزور انداز میں پروفیسر آرنلڈ نے اپنی مقدم الذکر کتاب میں پیش کیا[۳۵] اور اس کے بعد تو محققین و مورخین نے اسے ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا اور اسے نقد و احتساب کی بے لاگ کسوٹی پر پرکھنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی۔[۳۶]

اس میں شک نہیں کہ مختلف ادوار میں بہت سے صوفیہ نے انفرادی طور پر تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی کاوشیں اور جاں فشانیاں بھی کی ہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں انھیں کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں، کہیں کم، کہیں زیادہ اور کہیں غیر معمولی۔ ان کی یہ مساعی ہمیشہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ یاد رکھی جائیں گی اور جب بھی اشاعتِ اسلام کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس باب میں صوفیاء کرام کی خدمات کو وہ مقام دیا جائے گا جس کی وہ واقعی طور پر مستحق ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہر حال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اشاعت دین کے لیے سعی کرنا تصوف کے بنیادی مقاصد میں کبھی بھی شامل نہیں رہا بلکہ اس کا بنیادی مقصد نفس کی تہذیب و تزکیہ تھا۔ چنانچہ ان کا دائرہ عمل خود ان کے اپنے مقاصد کی نوعیت کے اعتبار سے مسلمانوں تک محدود تھا اور اس کی نوعیت عمومی نہیں تھی۔ صوفی مفکرین اور دانشوروں نے تصوف کے بنیادی مباحث، اس کے دائرہ کار، اس کے بنیادی فکر اور اس کے طریقۂ تعلیم و تہذیب پر مستقل کتابیں تحریر کی ہیں اور ان مسائل پر بڑے عالمانہ انداز میں پوری شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے اور اس سے متعلق کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اس پورے لٹریچر میں غالباً آپ کو کہیں بھی تبلیغ و اشاعت اسلام کا فریضہ صوفیہ کی بنیادی ذمہ داریوں ہی میں نہیں بلکہ عمومی ذمہ داریوں کے زمرے میں بھی نہیں ملے گا۔[۳۷]

اگر ہم سلاسل تصوف اور اکابر صوفیہ کی زندگیوں اور کارناموں کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے عموماً اپنی مساعی کا دائرہ صرف ان لوگوں تک محدود رکھا تھا جو ان کے دامن تربیت وارشاد سے وابستہ ہو جاتے تھے، بحیثیت مجموعی مسلم معاشرہ کی تہذیب واصلاح بھی ان کے پیش نظر نہیں تھی اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہ بات خود تصوف کے بنیادی فلسفے میں مضمر تھی۔ وہ صرف ان لوگوں کی اصلاح وتہذیب کی ذمہ داری قبول کرتے تھے جو ان کی اخلاقی اور روحانی بالادستی اور سیادت کو تسلیم کر لیتے تھے کیونکہ ان سے اکتساب فیض کی یہ شرط اول ہے چنانچہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت جو ان سے وابستہ نہیں ہے اور ان کی قیادت ورہنمائی پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ ان کے فیض جاری سے مستفیض نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہاں بنیادی شرط ہی مفقود ہے[۸]۔ جب یہ صورت حال خود مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ہے تو بدیگراں چہ رسد۔

تصوف کی تاریخ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ صوفیاء کرام اور ان کے مسترشدین و وابستگان نے بھی عموماً اس قسم کے دعوے نہیں کئے کہ انھوں نے اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں غیر معمولی جدوجہد کی ہو اور ان کی مساعی اسلام کی ترویج واشاعت کی باعث ہوئی ہوں۔ اس سلسلے میں جن کوششوں کا سراغ ہمیں مختلف ادوار میں ملتا ہے ان کا شمار مستثنیات میں کیا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے اکثر صوفیہ کے تعلق سے جہاں کہیں بھی اشاعت اسلام کا ذکر ملتا ہے وہ بطور خوارق وکرامات کے ملتا ہے[۹]، اس میں تبلیغ وتذکیر، جدوجہد اور کوشش وجانفشانی کا ذکر کم ہی ملتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ پڑھے لکھے حلقوں میں یہ تاثر کہ اشاعت اسلام بنیادی طور پر صوفیہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے آرنلڈ کی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کی اشاعت کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے ایسے عمومی تاثر کا نشان نہیں ملتا۔

یہ بات بہر حال خصوصی توجہ کے لائق ہے کہ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں صوفیاء کرام کے غیر معمولی کردار کا قطعی اور حتمی تاثر ایک مغربی عالم اور مستشرق کا مرہون منت ہے۔ پروفیسر آرنلڈ ایک حق پسند اور منصف مزاج محقق کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے ہیں اور ان کی تصنیفات کو بے لاگ اور متوازن تحقیقات کا درجہ حاصل رہا ہے[۱۰]۔ ان کا یہ مقام صرف مغرب ہی میں نہیں بلکہ مشرق میں بھی تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کتاب کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان حالات کو ذہن میں رکھا جائے جن میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھے بغیر اس کی صحیح قدر وقیمت اور واقعی اہمیت کا تعین حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا اور غلط نتائج اخذ کرنے کا احتمال باقی

رہے گا۔

یہ کتاب ایک ایسے وقت میں لکھی گئی جب مورخین اور مستشرقین اسلام اور تاریخ اسلام کو مسخ کرنے کی منظم کوشش میں مصروف تھے۔ خود ہندوستان میں برسوں پہلے سر ہنری الیٹ اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی" ترتیب دے چکے تھے اور ان کے انتقال کے بعد پروفیسر ڈاؤسن کی کوششوں سے شائع بھی ہو چکی تھی۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ایک بے حد جابرانہ اور انتہائی ظالمانہ حکومت تھی جس کا عدل و انصاف سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جس کے زیر سایہ بنیادی انسانی اقدار قطعی غیر محفوظ تھیں۔ سازش، شراب نوشی، عیاشی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ عیش و طرب کے لوازم مہیا کرنے کے لیے عوام کا بیدردانہ استحصال جس کا نشانہ خصوصاً غیر مسلم عوام ہوتے تھے اس حکومت کا نشانِ امتیاز تھا۔ معاشی استحصال، سماجی نابرابری اور مذہبی رواداری کا یکسر فقدان اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں غرض اس کتاب کے صفحات سے مسلم دور حکومت کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں کہی جا سکتی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی مہارت اور چابکدستی سے اقتباسات کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے اور انھیں اپنے مخصوص سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اقتباسات کے انتخاب میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھی گئی ہے کہ صرف ایسے حصوں کو منتخب کیا جائے جن سے مسلم حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی نہایت مکروہ اور گھناونی تصویر ابھر کر سامنے آئے۔

یہ اور ایسی دوسری کوششیں کثیر المقاصد تھیں۔ سب سے اہم اور بنیادی مقصد یہ تھا کہ ماضی کی ایسی گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی جائے کہ اس کو دیکھتے ہوئے برٹش گورنمنٹ خاص رحمت ایزدی محسوس ہونے لگے اور ہندوستانی عوام اسے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر گلے سے لگا لیں اور اس سے روگردانی اور بیزاری کا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں۔ یہ تو وہ مقصد ہے جسے خود سر ہنری الیٹ نے کتاب کے دیباچے میں پوری صراحت سے بیان کیا ہے[11] لیکن جن مقاصد کی وضاحت انھوں نے نہیں کی وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ غیر مسلموں کے ذہن و دماغ میں مسلمانوں کے خلاف غم و غصہ کے جذبات ابھارے جائیں تاکہ مسلمانوں اور غیر مسلمین کے درمیان اتحاد عمل کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکے جو برطانوی مفادات کے لیے خطرے کا باعث بن سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے پیچھے یہ خواہش بھی کارفرما ہو سکتی ہے کہ ایسی گمراہ کن تاریخ کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کے ذہن کو اس حد تک مسموم کر دیا جائے کہ وہ اپنے ماضی اور تاریخ سے متنفر ہو جائیں اور مغربی تہذیب و تمدن ان کو اپنی نجات کا واحد راستہ

سمجھ کر اپنا لیں۔ جو نسلیں ایسے ماحول میں پروان چڑھیں گی برطانوی سامراج کو ان کی طرف سے اندیشہ مند رہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جو نوجوان اپنی تاریخ سے بیگانہ ہی نہیں متنفر اور بیزار بھی ہوں ان سے تعاقب کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ محض بطور مثال ہے ورنہ یہ سلسلہ کچھ تاریخ ہند تک محدود نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ جہت کوشش کا صرف ایک پہلو تھا۔ اس منظم کوشش کا اصل ہدف خود اسلام اور پیغمبر اسلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تھی۔ تحقیق و علمی جستجو کے پردے میں کھلی ہوئی تنقیص، لعن طعن دشنام طرازی کا بازار گرم تھا۔[۱۴] ایسے ماحول میں مستشرقین کا ایک گروہ تصوف اور صوفیہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں مصروف و منہمک تھا۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اسلام کے مخالفین اس کے ایک پہلو کی بغیر کسی خاص سبب کے وکالت کرنے لگیں۔ اصولی طور پر یہ ممکن نہیں کہ اصل کا مخالف فرع کی حمایت کا بیڑا اٹھالے اس کے لیے کسی بہت خاص وجہ اور سبب کی موجودگی ضروری ہے۔ ظاہر ہے مقصد اسلام سے ہمدردی ہرگز نہ تھا بلکہ پیش نظر انھیں مقاصد کا حصول تھا جن کے لیے اول الذکر ذریعہ استعمال کیا گیا تھا۔ راستہ بالکل مختلف تھا لیکن نتائج وہی حاصل کرنے تھے۔ مقاصد کے گھناؤنے پن کو البتہ بڑی چابکدستی سے ہمدردی کی دبیز تہوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔ مسلمانوں میں تصوف اور صوفیا کرام کی غیر معمولی مقبولیت کے سہارے ان کی سوچ کے دھارے کو غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ دینے کی یہ نہایت شاطرانہ چال تھی۔ اس وسیلے سے مسلمانوں کے اندر زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ایک منفی نقطہ نظر پیدا کرنا ممکن تھا۔ تصوف کے نفوذ کے نتیجے میں ترک دنیا، حکومت و سیاست کی آلودگی کا تصور اور اس سے دوری و بیزاری کے رجحانات، ترک علائق اور گوشہ نشینی اور اس طرح کے میلانات کے فروغ کی راہیں کھلتی تھیں۔ برطانوی سامراج کے لیے اس سے زیادہ دلآویز اور اطمینان بخش اور کیا چیز ہو سکتی تھی کہ اس قوم کے اندر اس طرح کے خیالات پختہ ہو جائیں جو کل تک حاکم تھی اور جس کی طرف سے وہ بہت اندیشہ مند تھے۔ حکومت کے منصب سے محکومی کی منزل تک بڑا طویل، پیچیدہ اور صبر آزما مرحلہ ہے۔ ایک تو اس زخم کی کسک ابھی تک دل و دماغ میں کچھ اس طرح جاگزیں تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی تھی اور پھر روزمرہ کی زندگی میں مستقل ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا جو زخم کو ہرا کر دیتے تھے اور مجبوری و محکومی اور ذلت و نکبت کے احساسات کی شدت دو چند ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایسی قوم کے اندر جب تک جراحت کا احساس اور جہاد کی روح بیدار رہتی ہے خطرے کی سنگینی قائم رہتی ہے۔[۱۵] البتہ اگر کسی طور اس قوم کو احساسِ جراحت سے بے نیاز، گرد و پیش

سے غافل اور اپنے آپ میں مگن کر دیا جائے تو پھر خطرے کی کوئی بات باقی نہیں رہتی۔ یہ مقصد مسلمانوں کے اندر تصوف کی ترویج ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اگر احساسِ شکست و جراحت سے تلملاتی ہوئی اس قوم کے دل و دماغ میں، جو اپنے مقامِ گم گشتہ کی بازیافت کے لیے سرگرداں تھی، یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ دوام صرف ان کارناموں کو نصیب ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں شمشیروں کے سائے میں نقدِ جاں کو نثار کرکے نہیں بلکہ خانقاہوں میں پُرامن ذرائع سے حاصل کیے جاتے ہیں تو غاصب استعمار کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ گویا یہ کچھ اُسی قسم کی صورتِ حال ہے جس کی ترجمانی علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

چنانچہ صوفیاءِ کرام کے کارناموں کو جتنے مؤثر اور دلآویز انداز میں بیان کیا جائے اتنی ہی مسلمانوں کے دل و دماغ پر تصوف کی گرفت مضبوط ہوتی چلی جائے گی اور ظالموں اور غاصبوں سے پنجہ آزمائی کی خواہش کمزور اور دھیرے دھیرے معدوم ہوتی چلی جائے گی اور جد و جہد کی افادیت سے یقین اٹھتا چلا جائے گا۔ اور اگر تصوف اور صوفیاءِ کرام کی ستائش ایک مغربی عالم اور حاکم قوم کے ایک فرد کے قلم سے نکلے تو پھر اس کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے کہ الفضل ما شهدت به الاعداء۔ اس لیے یہ مسئلہ تفصیلی مطالعہ و تجزیہ کا طالب ہے کہ "پریچنگ آف اسلام" کی تصنیف سے پروفیسر آرنلڈ کا مقصد اشاعتِ اسلام کا ایک معروضی، متوازن اور منصفانہ مطالعہ تھا یا مسلمانوں کے اندر سے ہمدردی کے قالب میں مزاحمت کی روح کو کمزور کرنے کی ایک خواہش جو برطانوی مفادات کی حفاظت کی مختلف الجہات کوششوں کا حصہ تھی۔ یہ ضرور ہے کہ اگر پوری صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بظاہر اس قسم کے تاثر کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

تصوف اور اشاعتِ اسلام کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مؤرخین اس بارے میں دو بالکل متضاد باتیں بیک وقت بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ برصغیر میں اسلام کی توسیع و اشاعت کا بنیادی سبب صوفیہ کی مشنری سرگرمیوں کو بتاتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق صوفیہ کی خانقاہیں ہی آشوب و آلام اور ظلم و جبر سے بھری ہوئی دنیا میں وہ پناہ گاہیں تھیں جو کشاکشِ روزگار کی دسترس سے باہر تھیں، یہ امن و آشتی کے مسکن تھے جہاں دکھیاری انسانیت کے زخموں پر شفقت و محبت کا مرہم رکھا جاتا ہے۔ ان کے دروازے ہر کس و ناکس کے لیے ہر دم کشادہ اور ان کی آغوشِ شفقت ہر مظلوم و مجبور کے لیے ہمہ وقت وا تھی۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ میں اگر کوئی جگہ ایسی تھی

جہاں ہندو مسلمان، جوگی قلندر، جوان اور بوڑھے، شہری اور دیہاتی، عورت اور مرد سب جمع ہوتے تھے تو وہ صوفیاء کی خانقاہیں تھیں[15]۔ حسن خلق اور خدمت خلق ایسی صفات ہیں جن سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جہاں کہیں صوفیاء کرام پائے جاتے انھیں ایک خاص طرح کا قبول عام اور مرجعیت حاصل ہوجاتی تھی اور عوام الناس کی نظروں میں یہ مرجعیت اکثر ان کے اس عالم اسباب سے کوچ کرجانے کے بعد بھی ان کی مقابر کے وسیلے سے باقی رہتی تھی جنھیں درگاہوں کی حیثیت حاصل ہوجاتی تھی۔ اس طرح عزیز احمد کے بقول صوفیاء کرام کے گرد ایک دوہرا حلقہ خودبخود قائم ہوجاتا تھا۔ اندرونی حلقہ مخصوصین کا حلقہ ہوتا تھا جو مریدین اور خدام پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرا حلقہ بیرونی یا عمومی ہوتا تھا جس میں عام عقیدت مند شامل ہوتے تھے اور اس میں ایک معتدبہ تعداد غیر مسلموں کی بھی ہوتی تھی۔ ایک غیر محسوس عمل کے ذریعہ رفتہ رفتہ بیرونی حلقہ اندرونی حلقے میں جذب ہوتا رہتا تھا[16]۔ ظاہر ہے تاثیر و تاثر کے عمل اور ردعمل کا سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہوگا اور آس پاس کے پورے ماحول پر محیط ہوجاتا ہوگا۔ اس طرح جہاں ایک طرف حکمراں طبقے کی بے راہ روی اور ظلم و جبر عوام الناس کے دلوں میں نفرت و عداوت کے بیج بوتی تھی وہیں دوسری طرف صوفیاء کرام کی بے لوث خدمت اور بے ریا زندگی ان کے دلوں میں اس مذہب کے لئے عقیدت و محبت کے جذبات بیدار کرتی تھی جس سے یہ حضرات وابستہ تھے اور اس طرح اشاعت اسلام کی راہ ہموار ہوتی تھی[17]۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے تمام ہی صوفیاء خاموش تبلیغ پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ بعض اس کے لیے جدوجہد سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ تمام ہی صوفیا اپنی زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں تبلیغ و اشاعت اسلام کو ضروری خیال کرتے تھے۔

لیکن جب یہی مورخین ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی نشو و نما اور اس ملک میں بسنے والی مختلف اقوام کے درمیان مفاہمت، یک جہتی اور رواداری کی تاریخ لکھتے ہیں تو اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی صوفیاء کرام کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے "ہندوستان کے تہذیبی نقشے میں ہر دین اور ہر قبلہ گاہ کی اہمیت کو پہچان لیا تھا[18]"، جو "خدمت خلق کو عبادت کا درجہ دیتے تھے اور دل نوازی مخلوق کے ذریعہ خالق کائنات تک پہونچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی دل کو تسکین و راحت پہونچانا اعلاترین عبادت ہے۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است"، ان کا لائحہ عمل تھا۔ وہ پوری مخلوق کو اللہ کا کنبہ سمجھتے تھے اور 'الخلق عیال اللہ' پر سچا ایمان رکھتے تھے۔ ان کے دستور حیات میں قلوب انسانی کو ایک رشتۂ الفت میں پرو نا سب سے مقدس کام تھا[19]۔ چنانچہ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت

شیخ عبدالقدوس گنگوہی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

این چہ شور و این چہ غوغا کشادہ، کسے مومن، کسے کافر، کسے مطیع، کسے عاصی، کسے در راہ، کسے بے راہ، کسے مسلم، کسے پارسا، کسے ملحد، کسے ترسا، ہمہ در یک سلک است۔[۲۰]

یہ کیا شور و غوغا پھیلا دیا گیا ہے کہ کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی مطیع ہے کوئی گنہگار، کوئی صحیح راہ پر ہے کوئی بدراہ، کوئی مسلم، کوئی پارسا، کوئی ملحد، کوئی ترسا۔ (سچ تو یہ ہے) کہ سب ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

اسی وجہ سے ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کا ایک اہم اصول یہ رہا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شگفتہ تعلقات رکھے جائیں نافع السالکین میں لکھا ہے:۔

حضرت قبلہ من قدس سرہ فرمودند کہ در طریق ما ہست کہ با مسلمان و ہندو صلح باید داشت و این بیت شاہد آوردند

حضرت قبلہ قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سلسلے کا یہ اصول ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں سے صلح رکھنی چاہیے اور یہ بیت بطور دلیل پیش کرتے تھے:۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

یہ صلح جوئی اور مصالحت پسندی اس حد تک بڑھی کہ صوفیاء نے بہت سے ہندو طریقوں کو اختیار کر لیا اور ہندو ماحول میں یہ ان کی مقبولیت کا باعث ہے[۲۱] یہی نہیں اس کے زیر اثر شریعت کی حلال وطیب قرار دی ہوئی چیزوں کی ممانعت بلکہ تحریم تک بات پہونچ گئی۔ تاریخ تصوف کے مشہور محقق پروفیسر خلیق احمد نظامی 'سرور الصدور' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ حمید الدین ناگوریؒ اہنسا کے تصور میں پختہ عقیدہ کے باعث سبزی خور بن گئے تھے اور یہ پسند نہ کرتے تھے کہ ان کے لیے کسی جاندار کی جان جائے۔[۲۳] مزید برآں وہ 'انیس الارواح' کے حوالہ سے صوفیہ کے بارے میں یہ کہتے ہیں وہ اہنسا کے عقیدہ پر پابندی اور ہندو جذبات کے احترام کے باعث یہ سمجھتے تھے کہ جو بھی گائیں ذبح کرتا ہے اس نے گویا ایک آدمی قتل کیا، اسی طرح جس نے ۱۰۰ بکریاں ذبح کیں وہ بھی اسی جرم کا مجرم گردانا جائے گا۔ جو شخص محض لذت کے لیے ایک جانور کی جان لیتا ہے تو گویا اس نے انہدام کعبہ میں حصہ لیا۔[۲۴]

اب اگر" صوفی مختلف مذاہب کو خدا تک پہونچنے کے مختلف راستے مانتے تھے چنانچہ

دوسرے راستوں کے خلاف تنقید کو ناپسند کرتے تھے"[۲۵]، اگر وہ اتنے وسیع القلب تھے اور ان کی انسانیت دوستی اس مقام کو پہونچ چکی تھی جہاں نظریہ وحدۃ الوجود کے زیر اثر مومن و کافر کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور ویدوں کو الہامی کتابوں کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے[۲۵ الف] اور جب صورت حال یہ ہو جائے کہ "اجمیر کے شیخ حمید الدین چشتی نے اپنے ایک مرید کو مریدی سے خارج کر دیا تھا کیونکہ وہ مذہب کی ظاہرداریوں کو اہمیت دیتا تھا اور کسی غیر مسلم کی روح کے اندر جھانکنے سے قاصر تھا۔ ان کے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ کسی شخص کی روحانی حالت کیا ہے اور وہ خدا سے کتنا نزدیک ہے نہ کہ یہ بات کہ اس کے ماتھے پر کون سا لیبل لگا ہوا ہے"[۲۶] اور جب خدا کی محبت کا مفہوم اور مقصود یہ ہو جائے کہ "خدا کی محبت کو اپنا آدرش ماننے والوں کو خدا کے اوصاف کا اپنانا ضروری تھا یعنی جس طرح خدا نے سورج، پانی اور زمین جیسی تمام نعمتیں ہر ذات، رنگ، نسل اور کردار کے لوگوں کو یکساں طور پر بخشی ہیں اسی طرح انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھے۔ مذہب یا نسل کی بنیاد پر امتیاز کرنا خدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ لہٰذا صوفیوں کے فلسفہ حیات میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی"[۲۷] تو پھر اسلام کی توسیع و اشاعت کی ضرورت ہی کیا باقی رہتی ہے۔ اگر تمام راستوں کا منتہا ایک ہی ہے اور ان مختلف راستوں میں سے کسی بھی ایک راستے کو اختیار کر کے منزل مقصود تک پہونچا جا سکتا ہے[۲۸] تو پھر کسی مخصوص راستے کی طرف بلانے اور اس پر اصرار کرنے کا کوئی منطقی جواز نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے صوفیا کے فلسفہ حیات میں اس کے لیے بھی جگہ نہ ہونی چاہیے۔

چنانچہ یہ تصور کہ اسلام کی توسیع و اشاعت کا بنیادی سبب صوفیہ کی مساعی ہیں ان تاریخی تعمیمات میں سے ہے جنھیں بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے تسلیم کر لیا گیا ہے اور کبھی یہ ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ اسے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جائے۔ گذشتہ نو دس صدیوں سے عام طور سے مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر تصوف اور صوفیہ کی گرفت ایسی رہی ہے کہ تصوف کے حوالے سے خواہ کیسی ہی بعید از امکان اور محیر العقول باتیں کہی جائیں انھیں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تصوف اور صوفیہ کا نام آتے ہی کرامات و خوارق کا ایک طلسماتی عالم آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور ناممکنات ممکن نظر آنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو تحقیقات یا مطالعے کئے گئے ہیں وہ بھی عموماً معروضیت سے تہی اور عقیدت مندانہ ہیں۔ اس بات کی طرف توجہ نہیں دی گئی کہ اسلام کی توسیع کے عظیم کام میں علماء، ارباب تجارت، اصحاب حرفت اور عام مسلمانوں کا بھی کوئی رول رہا ہے یا نہیں۔ علماء کے سلسلے میں طرز عمل خصوصاً زیادہ افسوسناک رہا۔ ان کی ایک بڑی

تعداد جو صوفیاء کرام کی حلقہ بگوش نہ تھی اور حکومت کے مختلف اداروں سے وابستہ تھی ان کو علماء ظاہر، علماء دنیا اور علماء سوء کے نفرت انگیز القاب سے یاد کیا گیا اور ان کی کچھ ایسی تصویر پیش کی گئی کہ ان سے عمومی تنفر اور بیزاری کی فضا پیدا ہوئی دین حنیف کی حفاظت اور اس کی تعلیمات کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رکھنے کی جو سعی محمود اس طبقے نے کی اس کا صحیح طور پر اعتراف نہ کیا گیا اور اس کی واقعی قدر و قیمت متعین نہ کی جا سکی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے بنیادی مسائل کے بارے میں جو رائیں قائم کی گئیں وہ جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی اور تخمین و ظن پر مبنی رہیں۔

اس سلسلے میں کسی معروضی نتیجے تک پہونچنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف سلاسل تصوف کا علٰحدہ علٰحدہ مطالعہ کیا جائے۔ مزید سہولت کے لیے انھیں مختلف ادوار میں بھی بانٹا جا سکتا ہے۔ پھر عقیدت و محبت کے جذبات سے قطع نظر خالص حقائق کی روشنی میں پوری دیانت داری سے اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ زیر بحث سلسلہ تصوف کا اس مخصوص دور میں اشاعت و توسیع اسلام کے سلسلے میں کیا کردار رہا ہے اور اس بحث و تمحیص کے نتیجے میں جو تصویر بھی ابھرے اسے کسی تحفظ کے بغیر قبول کیا جائے چاہے وہ ہمارے مزعومات و تصورات کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔ جب ایسی بے لاگ تحقیقات برصغیر میں پائے جانے والے مختلف سلاسل تصوف کے بارے میں کسی حد تک پہنچ جائیں تو پھر شائد یہ ممکن ہو سکے کہ اس مسئلہ کے بارے میں کوئی عمومی نقطۂ نظر قائم کیا جا سکے جو تاریخی حقائق و شواہد پر مبنی ہو اور محض عقیدت و محبت کی بنیاد پر قائم نہ ہو۔

چشتی سلسلہ ہندوستان کا سب سے مقبول اور معروف سلسلہ تصوف ہے۔ جو وسعت اور قبولِ عام اس سلسلے کو نصیب ہوا وہ کسی اور سلسلہ تصوف کو حاصل نہ ہو سکا۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے لے کر دورِ حاضر تک ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس سلسلہ کی مختلف شاخوں سے وابستہ رہی ہے اور اس کے فیوض سے مستفید ہوتی رہی ہے۔ اس کی تاریخ بڑی تابناک اور درخشاں ہے اور اس کی روایات ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی ورثہ ہیں اور مسلمانوں کے اجتماعی شعور میں رچ بس گئی ہیں۔ اسی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ اسلام کی توسیع و اشاعت کے سلسلہ میں صوفیاء کرام کے کردار کا جائزہ چشتی سلسلہ سے شروع کیا جائے لیکن چونکہ یہ سلسلہ بہت وسیع اور ہمہ گیر اثرات کا حامل رہا ہے اس لیے یہ ممکن نہیں ہے اس عظیم الشان سلسلے کا جائزہ ایک مختصر سے مضمون میں لیا جا سکے بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس کے لیے پوری ایک تصنیف یا سلسلہ مضامین کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً چشتی سلسلہ کے عہد زریں

سے کی جائے جب اس سلسلہ کی مقبولیت اور اس کے اثرات کی ہمہ گیری اپنے کمال پر تھی اور اس کی مسند ارشاد خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاء، اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمہم اللہ اجمعین، جیسے مشائخ کبار رونق افروز تھے اور ایک عالم ان کے انوار سے مستنیر ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس دور کے بارے میں ہمارے پاس مستند تاریخی اور صوفی مآخذ کا اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے اور یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ حقائق و شواہد کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہونچا جا سکے۔

برصغیر میں چشتی سلسلہ کے بانی خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ ہیں۔ ہندوستان میں ان کی تشریف آوری اور ان کے ہاتھوں چشتی سلسلہ کی تاسیس و ترویج کو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ تسلیم کیا گیا ہے اور عموماً یہ مانا جاتا ہے کہ اس کے نہایت دوررس اثرات مسلمانوں کی اصلاح و تزکیہ کے علاوہ اسلام کی تبلیغ و توسیع کے سلسلے میں بھی مرتب ہوئے[۲۹]۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے انھیں ہندوستان میں صرف چشتی سلسلہ کے بانی ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ "اس ملک میں سلسلہ اسلامی کے بانی"[۳۰] کے خطاب سے یاد کیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کا تاثر یہ ہے کہ "حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا اسکندر اسلام سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے سر اور مستحکم و مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (م ۶۰۲ھ) کے حصے میں تھی اور آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجہ بزرگ شیخ الاسلام معین الدین چشتیؒ (م ۶۲۷) کے لیے مقدر ہو چکی تھی"[۳۱] اور "اس طرح ہندوستان میں جو کچھ خدا کا نام لیا اور اسلام کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانی سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حسنات اور کارناموں میں شامل کئے جانے کے لائق ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس ملک پر اس سلسلہ کا حق قدیم ہے"[۳۲] میر خورد نے انھیں "نائب رسول فی الہند"[۳۳] کے خطاب سے یاد کیا ہے اور ہندوستان میں اسلام کی نشر و اشاعت کا سہرا انھیں کے سر باندھا ہے اور اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قیامت تک اس ملک میں جو بھی دولتِ اسلام سے مشرف ہوگا نہ صرف اس کا ثواب بلکہ نسلاً بعد نسل ان کی اولاد کا ثواب بھی ان کی روح کو پہونچتا رہے گا[۳۴]۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ شیخ معین الدین چشتیؒ کے معتبر حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں۔ وہ مصادر اور مآخذ جن سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان سے شیخ بزرگ کی زندگی اور ان کی تبلیغی مساعی کی مستند اور قابل اعتبار تفصیلات حاصل ہوں گی اس سلسلے میں بالکل خاموش ہیں۔ شیخ نظام الدین

اولیاءؒ کے ملفوظات کا مجموعہ فوائد الفواد، جس کا رتبہ استناد عام طور سے مسلم ہے، خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شخصیت، ان کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات، ان کے کارناموں اور تبلیغ وارشاد کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ پوری کتاب میں ان کا ذکر صرف تین بار آیا ہے اور وہ بھی بالواسطہ[35] اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خیر المجالس خواجہ بزرگؒ کے ذکر سے قطعاً خالی ہے اور کسی بھی نسبت سے ان کا نام نامی پوری کتاب میں ایک بار بھی نہیں آیا ہے۔ حالانکہ دونوں ہی کتابوں میں شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں زیادہ تعجب اس لیے بھی ہوتا ہے کہ دوسرے صوفیا، کی طرح سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ بھی اپنے مطالب کو سمجھانے کے لیے اکابر صوفیہ کے حالات و واقعات کو بکثرت بیان کرتے ہیں اور دونوں کتابوں کا بڑا حصہ ایسے ہی واقعات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ عام طور پر مورخین نے میر خورد اور بعد کے دوسرے سوانح نگاروں کے بیانات کو بے کم وکاست تسلیم کرلیا ہے اور اس سلسلے میں کسی نقد وتبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ سیر الاولیاء کے بیانات سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ جب خواجہ بزرگؒ نے اجمیر کو اپنا مستقر بنایا اور اسے اپنی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں کے لیے بطور مرکز کے منتخب فرمایا اس وقت تک وہ فتح نہیں ہوا تھا اور ہنوز پرتھوی راج کی عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ ان دنوں اجمیر راجپوت سامراج کا مضبوط مرکز اور ہندوؤں کا مذہبی گڑھ تھا[36] فطری طور پر یہ صورت حال راجپوت حکمراں کو پسند نہ آئی اور اس نے ان کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنی شروع کردیں۔ اگرچہ حضرت خواجہؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے تاہم بین السطور یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھیں اس سلسلے میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی یہاں تک کہ پرتھوی راج کے ایک درباری نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ اسی نسبت سے اس منافشے کی صورت پیدا ہوئی جس کے سلسلے میں خواجہؒ نے فرمایا:

پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم بلشکر اسلام۔[37] ہم نے پتھورا کو زندہ پکڑا اور لشکر اسلام کے حوالے کردیا۔

چنانچہ سلطان معزالدین کی فتح اور پرتھوی راج کے زندہ گرفتار ہونے کا سبب یہی تھا۔ جواہر فریدی اور بعض دوسرے صوفی مآخذ میں کرامات کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں لوگوں کے مشرف باسلام ہونے کا ذکر ہے۔[38]

یہاں یہ موقع نہیں ہے کہ اس مسئلہ پر کوئی مفصل بحث کی جائے کہ خواجہ بزرگؒ کی اجمیر میں آمد کا صحیح وقت کیا تھا اور اس سلسلے میں پائے جانے والے شواہد کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے۔[39] البتہ مختصراً یہ

کہا جا سکتا ہے کہ اس ضمن میں دستیاب شواہد کے تنقیدی مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خواجہ بزرگؒ کی اجمیر میں آمد اس وقت ہوئی جب وہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آچکا تھا اور وہاں پر مسلمان گورنر متعین تھا۔[۲۰] خیال کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب راجپوتوں اور غوریوں کی کشمکش اپنے عروج پر تھی اجمیر میں قیام کیوں کر مفید ہو سکتا تھا؟ یہ فیصلہ اپنی جگہ پر بڑی عالی ہمتی کا مظہر ہو سکتا ہے لیکن اس کے پیچھے کوئی ٹھوس وجہ اور منطق کا ہونا ضروری ہے، ظاہر ہے خواجہ بزرگؒ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اتنا بڑا قدم بغیر کسی خاص دینی مصلحت کے اٹھاتے۔ اور اگر کسی بہت اہم دینی مصلحت کے باعث انھوں نے یہ قدم اٹھایا ہوتا تو یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہوتا اور فوائد الفواد، خیر المجالس اور ہم عصر اور بعد کے تاریخی مآخذ اس کے تذکرہ سے خالی نہ ہوتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سیر الاولیاء سے پہلے ہمیں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جو اس کی تائید کرتی ہو اور یہ معلوم ہے کہ سیر الاولیاء حضرت خواجہ کے ورود اجمیر کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد لکھی گئی۔ مورخین نے عموماً یہی موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت خواجہؒ اجمیر کی فتح کے بعد وہاں پہونچے تھے۔ صوفی تذکروں میں جمالی کی سیر العارفین' کا اپنا ایک مقام ہے اور اس میں پہلی مرتبہ خواجہ معین الدین چشتی کے مفصل حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں وہ اس سلسلے میں نہایت صراحت سے لکھتے ہیں کہ جب حضرت خواجہؒ اجمیر پہونچے تو "اس متبرک مقام پر اسلام کی رونق قائم ہو چکی تھی" اور وہاں پر سید السادات حسین مشہدی سلطان قطب الدین کی طرف سے بحیثیت داروغہ متعین تھے۔[۲۱] عبد القادر بدایونی کے بیان سے مترشح ہے کہ جس جنگ میں پرتھوی راج کو شکست ہوئی اس میں وہ سلطان معز الدین کے ساتھ تھے اور یہ فتح ان کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔[۲۲] فرشتہ نہایت صاف طور پر یہ بیان کرتا ہے کہ جب حضرت خواجہؒ اجمیر پہونچے تو وہاں سید حسین مشہدی بحیثیت داروغہ سلطان قطب الدین کی طرف سے متعین تھے۔[۲۳] ان واضح شواہد کی روشنی میں یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ جب حضرت خواجہؒ اجمیر پہونچے وہ راجپوت سامراج کا مضبوط مرکز نہ تھا بلکہ دلی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔

اس میں شک نہیں جب حضرت خواجہؒ وارد ہندوستان ہوئے وہ زمانہ ابھی نئی حکومت کے استحکام و استقرار کا نہ تھا۔ ابھی اس سلسلے میں بہت سے مسائل درپیش تھے بالخصوص جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ اجمیر دار السلطنت دہلی سے خاصا دور تھا اور شکست خوردہ راجپوت حکومت کا مرکز رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ہندوؤں کے اہم مذہبی گڑھ ہونے کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس دوگونہ نسبت کی وجہ سے اس سلسلے میں راجپوتوں کے جذبات کی شدت بھی قابل فہم ہے اس لئے اس امر میں شبہ نہیں کہ دہلی اور لاہور کے بجائے اجمیر کے دور افتادہ علاقہ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے

کا فیصلہ کرنا بڑی عالی ہمتی اور حوصلہ مندی کی بات تھی۔ یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ ایسے دور دراز علاقے میں، جس کو فتح ہوئے ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا اور جس کے آس پاس کے علاقے ابھی فتح ہونے باقی تھے، قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کرتے وقت مشنری سرگرمیوں کا کوئی خاکہ بھی ان کے ذہن میں رہا ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان کی مساعی کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے ہوں لیکن بنیادی اہمیت کی بات یہ ہے کہ ان مساعی کا کوئی تذکرہ ان کی سوانح حیات میں نہیں ملتا۔ ان کے ہاتھوں جن لوگوں کے مسلمان ہونے کا ذکر بعض صوفی مآخذ میں کیا گیا ہے ان کے سلسلہ میں بھی یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ واقعات صرف اس صورت میں مستند تسلیم کئے جا سکتے ہیں جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ جائے کہ حضرت خواجہ جب وارد اجمیر ہوئے تو وہ ہنوز فتح نہ ہوا تھا اور راجپوت حکومت کا مرکز تھا۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ واقعات کی صورت ایسی ہی تھی جیسا کہ تذکرہ نگاروں نے پیش کیا ہے تو بھی کسی مشنری سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ خوارق و کرامات کے ظہور کے نتیجہ میں بکثرت لوگوں کے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے علاوہ ان کے سوانح نگار ایسے واقعات پیش نہیں کرتے جن سے اندازہ ہو کہ کچھ لوگ بھی ان کی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہوں۔ اور اگر حضرت خواجہؒ نے ایسی کوشش فرمائیں اور اس کے نتیجے میں کچھ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے سوانح نگاروں اور اس سے بھی زیادہ ان کے جانشینوں نے اسے اتنا اہم نہیں سمجھا کہ انھیں ضبط تحریر میں لاتے اور اپنے حلقوں اور مجالس میں ذکر فرماتے۔ 'فوائد الفواد' اور 'خیر المجالس' کی اس باب میں مکمل خاموشی کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں: یا تو حضرت خواجہؒ نے حقیقتاً ایسی کوششیں نہیں فرمائیں اور اگر انھوں نے اس سلسلے میں جدوجہد کی اور اس کے نتائج بھی برآمد ہوئے تو یہ بات ان کے اہل اور لائق جانشینوں کی نظر میں اس اہمیت کی حامل نہ تھی کہ اس کا تذکرہ کیا جاتا۔ جو صورت بھی ہوئی ہو نتیجہ بہرحال یہی نکلتا ہے کہ یہ کام ان کے بنیادی مقاصد میں شامل نہ تھا اور اگر اس سلسلے میں کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں بھی تو وہ قابلِ ذکر نہ تھیں کیونکہ یہ ان کے مشن سے براہِ راست متعلق نہ تھیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور دہلی کے ابھرتے ہوئے شہر میں جو وسعت پذیر مسلم حکومت کا پایہ تخت تھا چشتی سلسلہ کی داغ بیل ڈالی اور اس کی تنظیم و توسیع کا کارنامہ انجام دیا۔ دہلی صرف ایک شہر نہیں تھا بلکہ نئی قائم شدہ حکومت کے لیے رگ جان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ تشکیل پذیر شہر جس کے اسلامی تشخص کے امتیازی نشان قطب مینار اور حوض شمسی ہنوز پردہ وجود پر ظاہر نہ ہوئے تھے منگولوں کی برپا کی ہوئی ہمہ گیر تباہی اور بربادی کے نہ

ختم ہونے والے طوفان کے غم نصیبوں کے لیے سفینۂ نوح کا مصداق بن گیا تھا۔ ایران و خراسان اور وسط ایشیا سے مسلمانوں کے لیے ہوئے قافلوں کی آخری امید اور منزل مراد یہی شہر دہلی تھا۔ کیسے کیسے علماء صلحاء، ادیب، شاعر اور اہل صنعت و حرفت خاک و خون کے سیلاب سے گزر کر یہاں پہونچے اور دہلی نے اپنی آغوش شفقت ان کے لئے وا کر دی اور انھیں وہ منزلت عطا کی جس کا تصور وہ اپنے مرز و بوم میں نہ کر سکتے تھے۔ اس طرح شہر دہلی ایک عالمی حیثیت اور مرکزیت حاصل کرتا جا رہا تھا کہ آئندہ صدیوں میں یہ شہر صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ ظاہر ہے خواجہ صاحبؒ کی دوربین نظروں سے دہلی کی اہمیت اور آئندہ سلسلہ کی اشاعت و توسیع کے سلسلہ میں اس کی موزونیت اور مناسبت پوشیدہ نہ رہی ہوگی۔ چنانچہ دہلی کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنانے کا فیصلہ ایک تاریخ ساز فیصلہ تھا اور بڑے دور رس اثرات کا حامل۔

حضرت خواجہؒ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں دہلی میں غیر معمولی مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی جو بہتوں کے لیے رشک و حسد کی باعث بن گئی۔ جو والہانہ عقیدت اور شیفتگی اہالیان دہلی اور خود سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہؒ کی ذات والا صفات سے تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا بڑا بلیغ اور موثر مرقع میر خورد نے سیر الاولیاء میں محفوظ کر دیا ہے۔ دہلی کے شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغری کی شکایت پر جب خواجہ معین الدین چشتیؒ نے خواجہ قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا فیصلہ کیا اور انھیں لے کر دہلی سے باہر نکلے تو کیفیت یہ تھی کہ

ازیں مقدمہ در تمام شہر دہلی شور افتاد	اس باعث پورے شہر دہلی میں کہرام برپا
ہمہ اہل شہر مع سلطان شمس الدین دنبال	ہو گیا۔ سلطان شمس الدین سمیت پورا شہر
برآمدند و ہر جا شیخ قطب الدین پی گذاشت	آپ کے پیچھے امڈ پڑا۔ جہاں بھی شیخ
خلائق خاک آں زمیں بہ تبرک برمی داشت	قطب الدینؒ قدم رکھتے تھے لوگ وہاں
و نہایت اضطراب و زاری می نمودند[۴۴]	کی مٹی کو بطور تبرک اٹھا لیتے تھے اور نہایت
	اضطراب اور بے قراری کا اظہار کرتے تھے۔

چنانچہ جب مرشد نے یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا:۔

بابا بختیار ہمدریں مقام باش کہ خلائق	بابا بختیار تم یہیں رہو کیونکہ لوگ تمہارے
از بیرون آمدن تو در اضطراب و خراب	جانے سے بہت مضطرب اور بیقرار ہیں۔
است۔ روا نداریم کہ چندیں دلہا خراب	میں یہ درست نہیں سمجھتا کہ اتنے دل تنگیں

وکباب باشند[۶۵]

و آزردہ ہوں۔

یہ غیر معمولی اثر اور مقبولیت چشتی سلسلہ کی توسیع و اشاعت کے علاوہ کسی اور تعمیری کام یا اسلام کی تبلیغ و ترویج کے سلسلہ میں استعمال ہونے کی کوئی تاریخی شہادت دستیاب نہیں ہے۔ اس ابھرتے ہوئے مرکز سلطنت میں اشاعت اسلام کے مواقع غیر محدود تھے لیکن اس باب میں آخذ خاموش ہیں اور کسی خواہش، کوشش یا منصوبہ بندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ اگر عزیز احمد کی یہ بات قرین صداقت ہوتی کہ بیشتر صوفی سلسلے اور انفرادی طور پر صوفیہ بھی غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کو اپنی بنیادی روحانی ذمہ داریوں میں تصور کرتے تھے[۶۶] تو پھر اس سلسلے میں صوفی مآخذ کی خاموشی کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے صوفیہ اپنی ذمہ داریوں کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے۔ چنانچہ اس خاموشی کا اس کے سوا کوئی اور سبب نہیں ، ۔ ، ، ، کہ اشاعت اسلام کے لیے جدوجہد بنیادی طور پر ان کے لائحہ عمل کا جزء نہ تھی۔

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے سلسلے میں بڑی دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے۔ مقامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کے متعدد قبائل ان کے ذریعہ مشرف باسلام ہوئے۔ یہ مقامی روایات ڈسٹرکٹ گزیٹرس اور اسی نوعیت کی دوسری تصنیفات میں محفوظ کرلی گئیں۔[۶۷] ان روایات کی صحت کو تسلیم کرلینے کے بعد بھی اس سلسلے میں کئی سوالات تشنۂ جواب رہ جاتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگانے کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ ایسا کن حالات میں ہوا۔ شیخ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنے کے حتمی طور پر یہ معنی نہیں لیے جاسکتے کہ اس کے حالات انھیں کی تبلیغی مساعی کے زیر اثر پیدا ہوئے ہوں الّا آں کہ یہ بات واضح طور پر بیان کردی جائے۔ ورنہ اس بات کا احتمال بہرحال باقی رہتا ہے کہ ان قبائل کے اسلام قبول کرنے کے فیصلے کے پیچھے کچھ اور ہی عوامل رہے ہوں یا اس کے حالات کچھ دوسرے لوگوں کی کوششوں سے پیدا ہوئے لیکن کسی طور بھی جب یہ فیصلہ کرلیا گیا تو اس نواح کے سب سے زیادہ جانے پہچانے بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا زیادہ بہتر اور مناسب معلوم ہوا۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جس کا مظاہرہ اب بھی کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے۔ پھر ان قبائل کے علاوہ ان کے ذریعہ انفرادی قبول اسلام کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر شیخ اس قسم کی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہوتے تو بظاہر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ قبائل کے اجتماعی قبول اسلام کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ انفرادی طور پر بھی اسلام قبول کرتے رہتے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی مشنری سرگرمی کا کوئی ذکر صوفی یا تاریخی آخذ میں نہیں ملتا۔ سلطان المشائخؒ ایک عرصہ تک اجودھن میں مقیم رہے

اور دہلی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی وہ وہاں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ وہ اپنے مرشد کا ذکر بڑی تفصیل سے اپنی مجالس میں کرتے تھے لیکن وہ بھی اس باب میں بالکل خاموش ہیں اگر یہ پہلو شیخ فریدالدینؒ کے لائحہ عمل میں شامل ہوتا اور اسے وہ اپنی بنیادی سرگرمیوں میں محسوب فرماتے اور اس کے نتیجہ میں قبول اسلام کے واقعات پیش آتے تو جو عقیدت ومحبت سلطان المشائخؒ کو اپنے مرشد سے تھی اس کے پیشِ نظر یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس سے صرف نظر فرماتے اور اس کا ذکر نہ فرماتے۔ شیخ اکرام بھی جو یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شیخ فریدالدینؒ کو اشاعت اسلام میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اس سلسلے میں کسی کوشش اور جدوجہد کا نشان نہیں دیتے بلکہ اظہار کرامت کو اس کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آب کوثر میں وہ رقم طراز ہیں "باباصاحب نے اشاعت مذہب اور تبدیلِ عقائد کی جو مثالیں یادگار چھوڑی ہیں ان میں اظہار کرامت کو بڑا دخل ہے۔..... حضرت باباصاحب کو جن لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا وہ سادہ اور ضعیف الاعتقاد تھے۔ ان پر کرامات کا بڑا اثر ہوتا تھا چنانچہ باباصاحب اپنے تصرفات کی بنا پر ان میں شاندار نتائج پیدا کرسکے"[۱۴]۔ یہاں یہ تذکرہ شائد بے محل نہ ہو کہ فوائدالفواد اور دوسری مستند کتابوں میں شیخ فریدالدینؒ کی بے شمار کرامات بیان کی گئی ہیں اور ان میں سے بعض کے نتیجے میں متعلقہ افراد کے تائب ہونے اور شیخ کے باب میں عقیدت مندی کے جذبات کے پیدا ہونے کا ذکر تو ضرور ملتا ہے لیکن کسی کے مسلمان ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

چشتی بزرگوں خصوصاً شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے جوگیوں کے روابط کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے فوائدالفواد میں چند ایسے واقعات کا تذکرہ موجود ہے لیکن کسی موقع پر بھی کسی تبلیغ وتذکیر اور انھیں اسلام کی طرف مائل کرنے کی کسی کوشش اور خواہش کا پتہ نہیں چلتا۔ فوائدالفواد میں تین مواقع پر شیخ فریدالدینؒ کے جماعت خانہ میں کسی جوگی کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ جوگی کی موجودگی سے نصیر نام کے ایک متعلم نے یہ فائدہ اٹھانا چاہا کہ اس سے سر کے بالوں کی درازی کا طریقہ معلوم کرنے کی کوشش کی اور یہ چیز فطری طور پر شیخ کی آزردگی کی باعث ہوئی[۱۵]۔ ایک دوسرے موقع پر ایک جوگی کی موجودگی میں شیخ کی مجلس میں یہ ذکر چھڑ گیا کہ جو بچے بے ذوق ہوتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو ازدواجی تعلقات قائم کرنے کے صحیح اوقات نہیں معلوم ہوتے۔ اس پر جوگی نے مہینے کے تمام دنوں کی خاصیتیں بیان کرنی شروع کیں اور شیخ نظام الدین اولیاؒ نے یہ تمام تفصیلات ذہن نشین کرلیں اور جوگی کو سنا کر اس سے تصدیق چاہی۔ شیخ فریدالدینؒ کا اس پورے قصے کے سلسلہ میں صرف یہ ردعمل بیان کیا گیا ہے کہ:-

چوں ایں سخن بگفتم شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز روی سوی من کرد و گفت تو ازیں چیز ہا بہر چہ می پرسی کہ ترا ہرگز کار نخواہد آمد[۱۵۸]

جب میں نے یہ بات کہی تو شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا کہ تم ان چیزوں کے بارے میں کس واسطے پوچھ رہے ہو کیونکہ یہ ہرگز تمہارے کام آنے والی نہیں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر جب ایک جوگی شیخ فرید الدینؒ کے جماعت خانہ میں موجود تھا تو شیخ نظام الدینؒ نے اس سے پوچھا کہ تم لوگوں کے یہاں اصل چیز کیا ہے۔ جوگی نے جواب دیا کہ ہمارے علم کی رو سے نفس آدمی دو عالم پر مشتمل ہے عالم علوی اور عالم سفلی اور اس کی کسی قدر تفصیل بیان کی۔ اس کے بارے میں شیخ نے اپنے اس تاثر کا اظہار فرمایا کہ مرا سخن او خوش آمد[۱۵۹]۔ خیر المجالس میں صرف ایک جگہ جوگیان سدھ کا تذکرہ ہے جو "انفاس شمردہ می زنند" اور غالباً اسی کے زیر اثر حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا " ولہذا صوفی آنست کہ نفس او شمردہ باشد"[۱۶۰]۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ اگر ان جوگیوں سے، جو حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی مجلسوں میں حاضر ہوتے رہتے تھے، تبلیغ اسلام اور اس سے متعلق موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی تھی تو تمام مصادر و ماخذ اس کے ذکر سے قطعی طور پر کیوں خالی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مقدم الذکر تمام واقعات میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ جوگیوں کے علم اور تجربات و معلومات سے استفادہ کی خواہش اور کوششوں کا پتہ چلتا ہے، انھیں کچھ بتانے اور تعلیم و تلقین کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی جوگی خود صوفیائے کرام سے مستفید ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

مشائخ چشت میں سب سے زیادہ مفصل اور مستند حالات زندگی سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلہ میں دستیاب ہیں۔ جو قبول عام، مرجعیت اور شہرت ان کو ملی اس کی نظیر برصغیر کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں مفقود ہے۔ ان کے عقیدت مندوں میں بوریہ نشینوں کے شانہ بہ شانہ وقت کا عظیم ترین حکمراں سلطان علاء الدین خلجی اور اس کے اہل خانہ اور امراء شامل ہیں۔ ان کے مریدین کا حلقہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک مسند ارشاد پر جلوہ افروز رہے اور امیر حسن سنجری جیسے قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز ادیب نے کچھ اس عقیدت و محبت اور کامیابی سے ان کے ملفوظات کو جمع کیا ہے کہ ان کی مجالس کی تصویر سی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم بھی اس پاکیزہ مجلس میں حاضر ہیں اور اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سیر الاولیاء، تاریخ فیروزشاہی

خیر المجالس اور امیر خسرو کی کتابیں اور دوسرے بہت سے مآخذ سے شیخ کی حیات و تعلیمات کی مکمل تصویر اور وہ مقاصد جن کی تکمیل کے لیے وہ زندگی بھر کوشاں رہے ان کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔ واضح رہے کہ اوپر جن مآخذ کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب ان کے اپنے مریدین کے رشحات قلم ہیں۔ ان مآخذ کے صفحات میں اور ان سے ابھرنے والی تصویر کے خدو خال میں جستجو و تلاش بسیار کے باوجود اشاعت اسلام کی کوشش اور غیر مسلمین کو اسلام کی طرف راغب و مائل کرنے کی خواہش کا نشان کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں شیخ اکرام لکھتے ہیں "یہ صحیح ہے کہ اشاعت اسلام کے معاملے میں سلطان المشائخ اپنے مرشد سے بہت پیچھے ہیں۔ تواریخ میں ان کے ہاتھ سے فقط ایک آدمی کے مسلمان ہونے کا سراغ ملتا ہے لیکن وہ اشاعت مذہب سے غافل نہ تھے۔ فوائد الفواد میں دو ایک جگہ ہندوؤں کا اسلام سے دور رہنے کا ذکر ہے اور ایک دفعہ تو خواجہ صاحب نے آنکھوں میں آنسو لا کر اس امر کا افسوس کیا کہ ہندوؤں پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا"[۵۳] حاشیہ میں شیخ صاحب نے اس ہندو کا نام کنو بتایا ہے جو بعد میں خان جہاں کے نام سے سلطان فیروز تغلق کا وزیر اعظم بنا[۵۴] لیکن انھوں نے اپنا ماخذ نہیں بتایا ہے۔ اس کے برخلاف شمس سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں وضاحت سے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ خان جہاں نے سلطان محمد تغلق کے سامنے اسلام قبول کیا[۵۵]۔ تاریخ مبارک شاہی نے البتہ عبید شاعر کے ضمن میں ایک ہندو کے شیخ کے ہاتھ پر قبول اسلام کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا نام اور کسی طرح کی کوئی تفصیل اس کے قبول اسلام کے سلسلہ میں نہیں دی ہے۔[۵۶]

پروفیسر محمد حبیب کا شمار ان مورخین میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان میں صوفیاء کرام اور تاریخ تصوّف پر تحقیقات کی ابتدا کی اور زندگی بھر انھیں اس میں گہری دلچسپی رہی۔ سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے انھیں غیر معمولی عقیدت تھی۔ اپنی تحقیقات کی روشنی میں اس سلسلے میں وہ جس نتیجے تک پہونچے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہاں ہم ان کا جو اقتباس نقل کر رہے ہیں وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے لیکن زیر بحث مسئلہ کے بارے میں وہ اسی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے پورا کا پورا نقل کر دیا جائے:۔

> "اسلامی صوفیوں میں سب سے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے اسلام اور دیگر مذاہب کو ایک ہی ترازو میں رکھا ہے اور سب کو خدا کے راستے بتلائے ہیں۔ شیخ ابن عربی کے طریقہ تحریر کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اعتراض ہوا۔ لیکن اسی خیال کو مولانا روم نے ایک قصے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ قصے کے آخر میں ایک ملہمی وحی ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوتی ہے۔ اور اس وحی کے دو شعر حسب ذیل ہیں:

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم | ہر کسے را اصطلاح دادہ ایم
ہندیاں را اصطلاح ہند مدح | سندھیاں را اصطلاح سند مدح

(یعنی باری تعالیٰ نے ہر قوم کو ایک اخلاق یا سیرت عطا فرمائی ہے اور ہر قوم کو ایک مذہبی اصطلاح دی ہے۔ ہند والوں کے لیے ہند کی اصطلاح مدح کہی جائے گی اور سند والوں کے لیے سند کی اصطلاح تعریف شمار کی جائے گی۔)

حضور شیخ نظام الدین اولیاء کے خیالات بھی قریباً یہی تھے۔ جن پندرہ یا سولہ سالوں میں امیر حسن سنجری نے فوائد الفواد قلم بند کی ہے، علاءالدین خلجی اور مبارک شاہ کی لڑائی ہندو راجاؤں سے رہی ہے۔ دونوں طرف سے تنخواہ دار لشکری لڑتے تھے اور مارے جاتے تھے۔ آپ کو سلطنت کی توسیع میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آپ نے لفظ 'شہید' کسی مسلمان لشکری کے بارے میں استعمال نہیں کیا ہے لیکن اگر ایک مسلمان کو ہندو ڈاکو قتل کر دیتے تھے تو آپ اسے شہید سمجھتے تھے۔ یہ قصہ غلط ہے کہ سلسلہ چشتیہ کے صوفیوں نے اسلام کی کوئی تبلیغی کوشش کی ہے۔ صوفیوں کے لیے یہ کام ناممکن تھا چونکہ ان کی اصطلاحیں اور ان کی روایات صرف تعلیم یافتہ مسلمان سمجھ سکتے تھے۔ مسلم صوفیوں کا کام مسلمانوں میں محدود تھا۔

مجلس مورخہ ۵ رمضان ۷۱۰ھ میں امیر حسن سنجری لکھتے ہیں "ایک مسلمان غلام جو حضور کا مرید تھا ایک ہندو کو اپنے ساتھ لایا اور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو حضور نے دریافت کیا کہ تیرا بھائی کچھ اسلام کی طرف مائل ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو آپ کی خدمت میں لایا ہوں تاکہ آپ کی نظر کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپ نے فرمایا کہ لوگوں کے دل صرف کہنے سے نہیں بدلتے۔ ہاں اگر کسی نیک مسلمان کی صحبت سے مستفید ہوں تو ممکن ہے اس کی صحبت کی برکت سے مسلمان ہو جائیں"۔ پھر اور باتوں کے بعد حضور نے اسلام اور مسلمانوں کی صدق و دیانت کے بارے میں کہا کہ شیخ بایزید بسطامی کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا جب شیخ بایزید کا انتقال ہو گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہودی نے کہا میں مسلمان کیوں ہوں؟ اگر اسلام وہ مذہب ہے جو شیخ بایزید کا تھا تو میرے بس میں نہیں اور اگر اسلام وہ مذہب ہے جو میں تم

لوگوں میں پاتا ہوں تو مجھے ایسے اسلام سے شرمندگی ہوتی ہے۔ مستند کتابوں میں یہی ایک موقع ہے جب آپ ایک ہندو کو مسلمان کر سکتے تھے اور حضور اس کو ٹال گئے۔[۵۶]

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیا کرام کی خانقاہوں اور جماعت خانوں میں سماج کے ہر طبقے کے افراد بلا تخصیص مذہب وملت حاضر ہوتے تھے اور اپنے درد کا درماں پاتے تھے اور یہ چیز حکومت کے جبر کی شدت کو بڑی حد تک کم کر دیا کرتی تھی۔[۵۷] لیکن فوائد الفواد اور خیر المجالس میں غالباً مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ کسی اور ایسے موقع کا تذکرہ نہیں ہے جس میں شیخ نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کی کسی مجلس میں کسی غیر مسلم کی شرکت کا ذکر ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کی مشغولیات اور مصروفیات کی جو نوعیت تھی اور عبادات واذکار کی مداومت کی جو کیفیت تھی اس کے پیشِ نظر اس کا امکان نہ تھا کہ وہ جماعت خانہ سے باہر غیر مسلموں سے کسی درجہ کا بھی ربط قائم کر سکتے۔ بعض دوسرے صوفیاء کے لیے غالباً ان کے اپنے مخصوص حالات اور ضروریات کے پیش نظر یہ ممکن رہا ہو لیکن سلطان المشائخ کی مصروفیات، ان کے مریدین کی غیر معمولی تعداد اور ان کی تہذیب واصلاح کا بار عظیم اور پھر عام عقیدتمندوں کا سیل مسلسل، جس کی تفصیلات تاریخ فیروز شاہی کے صفحات میں محفوظ ہیں[۵۹] کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو بآسانی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ان گوناگوں ذمہ داریوں اور مشغولیات کے ساتھ ساتھ یہ ممکن نہ تھا۔ مذکورہ بالا واقعہ میں آپ نے ہندوؤں کے بارے میں جس تاثر کا اظہار فرمایا ہے اس سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں زبانی تبلیغ وتلقین کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا البتہ اگر کسی مرد صالح کی صحبت میسر آجائے تو اس کی برکت سے امید ہے کہ مسلمان ہو جائیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چشم پر آب کرد وفرمود کہ ایں قوم را چنداں بگفتہ کسی دل نگردد اما اگر صحبت صالحے بیابد امید باشد کہ ببرکت صحبت او مسلمان شود۔[۶۰]	حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ اس قوم پر کسی کے کہنے کا کم ہی اثر ہوتا ہے البتہ اگر کسی صالح کی صحبت مل جائے تو امید ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے مسلمان ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کو آپ کی صحبت میں رہنے کے مواقع میسر نہ تھے۔ اور اگر اشاعت اسلام کا مسئلہ حضرت شیخ کی ترجیحات میں شامل ہوتا تو یہ امر یقینی ہے کہ وہ اس پر غور وفکر فرماتے اور اس کی تکمیل کے لیے کوئی طریق کار اختیار فرماتے۔ اگر ہندوؤں پر زبانی تلقین وتبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو بھی محض اس

باعث یہ ذمہ داری ساقط نہ ہو جاتی بلکہ اپنی سی کوشش تو بہر حال کرنی تھی۔ چنانچہ اس پوری صورت حال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شیخ اسے اپنی بنیادی ذمہ داریوں میں محسوب نہیں فرماتے تھے۔

ایسی شہادتیں ضرور موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخؒ کے مریدین نے دکن، گجرات اور بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دیں[61] لیکن یہ زیر بحث موضوع کے دائرہ کار سے خارج ہے اس لیے یہاں اس کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے اگر ان بزرگوں کو اشاعت اسلام کے مقصد سے ان علاقوں میں بھیجا گیا ہوتا یا اس سلسلے میں انھیں کچھ ہدایات دی گئی ہوتیں تو یہ ضرور زیر نظر موضوع کے دائرہ کار میں آجاتا لیکن ایسی تاریخی شہادتیں دستیاب نہیں ہیں۔ بظاہر محسوس ایسا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے جو کچھ کوششیں اشاعت اسلام کے باب میں کیں وہ ان کے علاقوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کے اپنے ذاتی فیصلوں کے زیر اثر تھا اور مرشد کی ہدایات کی تکمیل کے طور پر نہ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ اکرام کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ شیخ نے کوئی ایسا نظام قائم کیا تھا جس کے ماتحت اشاعت کا کام ملک کے مختلف حصوں میں انجام پاتا رہا[62]۔ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت شیخ نے اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی نظام قائم کیا ہو یا اس سلسلے میں انھوں نے کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہو۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی جب مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے تو خلجیوں کا عہد حکومت ختم ہو چکا تھا اور تغلق حکومت قائم و مستحکم ہو چکی تھی۔ خلجی دور حکومت خصوصاً سلطان علاء الدین خلجی کا عہد چشتی سلسلہ کا عہد زریں تھا اور اس زمانے میں اسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ مختلف اسباب کے باعث جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، وہ صورت حال تغلق عہد میں قائم نہ رہ سکی[63]۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں علاء الدین اپنی ذاتی زندگی میں پابندی مذہب کے سلسلہ میں کافی کمزور نظر آتا ہے[64] وہیں محمد تغلق اپنی ذاتی زندگی میں مذہب پر سختی سے کاربند تھا[65]۔ خلافت سے جذباتی لگاؤ تھا[66] اور علماء و صلحاء سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے پوتے شیخ علاء الدین اجودھنی کا مرید تھا[67]۔ اس کے زمانے میں تصوف اور صوفیہ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ صبح الاعشی کی روایت کے مطابق دہلی میں اس وقت ۲ ہزار خانقاہیں تھیں[68]۔ تاریخ مبارک شاہی کے بیان کے مطابق اس نے دہلی سے دیوگیر تک ہر منزل پر علاوہ سرائے کے خانقاہ بھی تیار کرائی[69]۔ لیکن مذہب سے تمام تر دلچسپی کے باوجود دہلی میں چشتی سلسلہ کے لیے حالات بہت زیادہ سازگار نہ تھے[70]۔ لیکن تعلقات میں اس کشیدگی سے قطع نظر یہ بات عام طور سے مانی جاتی ہے کہ اسے اشاعت اسلام سے

دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں اس نے دہلی کے چشتی بزرگوں سے تعاون بھی چاہا۔ چنانچہ سیر الاولیاء میں مولانا شمس الدین یحییٰؒ خلیفہ سلطان المشائخ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ سلطان نے ان کو بلا کر ان سے کہا کہ :۔

ہمچو تو دانشمندے ایں جا چہ کند؟	آپ جیسا عالم یہاں کیا کر رہا ہے؟
تو در کشمیر برو و در بت خانہائے آں	آپ کشمیر جائیں، وہاں کے بت خانوں
دیار بنشیں و خلق خدا را با سلام	میں بیٹھ جائیں اور خلق خدا کو اسلام کی
دعوت کن۔[۵۵]	دعوت دیں۔

اگرچہ شیخ نصیر الدین کے بارے میں یہ بات وضاحت سے آخذ میں بیان نہیں ہوئی ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ غالبًا وہ ان سے بھی اس باب میں مدد کا خواستگار ہوا ہوگا۔ جو صورت حال بھی رہی ہو یہ بات تو یقینی ہے کہ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں محمد تغلق سے کسی معاونت یا پھر اپنے طور پر کسی کوشش کا تذکرہ حضرت چراغ دہلیؒ کے حالات زندگی کے ضمن میں آخذ میں دستیاب نہیں ہے۔ اگر آپ نے محمد تغلق سے اس باب میں تعاون فرمایا ہوتا یا اپنے طور پر اس سلسلے میں جد و جہد کی ہوتی تو توقع تھی کہ آخذ ان کے ذکر سے یکسر خالی نہ ہوتے۔ وجہ ظاہر ہے یہ نہ تھی کہ حضرت چراغ دہلیؒ سلطان سے اس باب میں بھی تعاون کو غلط سمجھتے تھے بلکہ غالبًا اسے وہ اپنی بنیادی ذمہ داریوں کے دائرہ کار سے خارج سمجھتے تھے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ برصغیر کے سب سے ممتاز و مقبول سلسلہ تصوف کے عہد زریں کے مشائخ نے، جو ہندوستان میں تصوف کے اساطین کا درجہ رکھتے ہیں، اسلام کی توسیع و اشاعت کے سلسلہ میں کوئی عملی جد و جہد نہیں کی اور یہ کام ان کے پروگرام اور ترجیحات میں شامل نہ تھا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں لوگوں کے قبول اسلام کے جو واقعات ملتے ہیں وہ کسی عملی جد و جہد کا نتیجہ نہ تھے بلکہ کرامات و خوارق کے زیر اثر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اس کے لئے کسی منصوبہ بندی، پروگرام اور کوشش و جانفشانی کا سراغ نہیں ملتا۔ اور غالبًا جو مقاصد ان کے پیش نظر تھے ان کے ساتھ ساتھ یہ کام ممکن بھی نہ تھا اور جیسا کہ شیخ اکرام نے لکھا ہے[۵۶] انھوں نے اپنے آپ کو فقط غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کے لیے وقف نہ کر رکھا تھا بلکہ تبدیلِ مذہب تو (سوائے بعض اسماعیلیوں اور سہروردیوں کے) شاذ ان کا مقصد اولین ہی نہ تھا۔ ایک ہندو کے قبول اسلام سے انھیں جتنی خوشی ہوتی شاذ اس سے زیادہ ایک مسلمان کے ترک گناہ سے ہوتی[۵۷] اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ بات خود تصوف کے بنیادی فلسفے میں مضمر ہے۔ چنانچہ یہ تصور کہ برصغیر میں اسلام کی

توسیع واشاعت کا کارنامہ اصلاً صوفیاء کرام کے ہاتھوں انجام پایا ایک ایسی تاریخی تعمیم ہے جس کے بارے میں بہت کچھ تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔

حواشی وحوالے

لہ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے P. Hardy, Modern European and Muslim Explanations of Conversion to Islam in south Asia- A Preliminary survey of the literature, Journal of Royel Asiatic society, 1977 No. 2, P.P 177-206; Titus Murray T. Indian Islam, New Delhi, Reprint, 1979, P.31; The struggle for Empire, Bharat vidya Bharan, Bombay, 1966, Introductinn by K.M. Munshi, PP. XII - XVII; K.S. Hal, Early Muslims in India Delhi 1984 PP. 28-33, 113-116.

ٹلہ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۹۶ء لندن سے شائع ہوئی۔ اس وقت آرنلڈ علی گڑھ میں استاذ تھے

سلہ T.W. Arnold, Preaching of Islam, Lahore 1961 PP. 259 263-265

ٹلہ دہلی اور آگرہ مسلم اقتدار کے مراکز تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں دہلی اور اس کے نواح میں مسلم آبادی کا تناسب مجموعی آبادی کے دسویں حصہ سے زیادہ نہ تھا۔ آگرہ میں صورت حال نسبتاً بہتر تھی لیکن وہاں بھی تناسب ایک چوتھائی سے کم تھا۔ ظاہر ہے اگر اشاعت اسلام میں طاقت اور جبر کا استعمال ہوا ہوتا تو جو مقامات صدیوں مسلم حکومت کے مراکز رہے وہاں یہ صورت حال نہ ہوتی بلکہ آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہوتا ملاحظہ کیجئے W.W. Hunter, The Religions of India, The Times, February 25the 1888 quoted from Preaching of Islam, P. 265, N.2 نیز ملاحظہ کیجئے S.M. Ikram, Muslim civilization in India ed by Ainslie T. Embree Columbia University press New York 1964, PP. 123-24-

ھ Preaching of Islam PP. 257-297

لہ کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے Richard Maxwell Eaton,

Sufis of Bijapur, 1300-1700, Princeton university press 1978 PP. 155-56, 156 n. 50

نیز دیکھیے پروفیسر خلیق احمد نظامی "تاریخ مشائخ چشت" ادارۂ ادبیات دلّی، ۱۹۸۰، جلد اول، ص ص ۳۵-۳۶ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ص ۸۵-۸۶، ۲۱۳، ۲۱۷، ۲۵۱ وغیرہ؛ وحید احمد مسعود، سوانح خواجہ معین الدین چشتی، سلمان اکیڈمی، کراچی، ص ص ۲۶۲-۲۷۵۔

۵۷ صوفیہ کی تعلیمات میں یہ چیز عام ہے کہ تصوف کے رموز و اسرار کو عوام کے سامنے نہیں بیان کرنا چاہیے مثال کے طور پر ابو طالب مکی (قوت القلوب، مصر، ۱۹۳۳ء، جلد اول، ص ۲۱) کہتے ہیں کہ "کان عند اہل العلم ان علمہم مخصوص لا یصلح الا لمخصوص"۔ اس اصول کی بنیاد پر فارسی ادب اور تمدن کی مشہور ماہر پروفیسر لیمبٹن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ صوفیہ عوام الناس کے سلسلے میں خاصے عدم اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسا کہ مریدین کو غیر مریدین سے الگ رکھنے کی حکمت عملی سے بھی مترشح ہے۔ یہ رجحان ظاہر ہے عوام سے قریبی رابطے اور انھیں اسلام کی طرف جذب کرنے کے عمل میں حارج ہے۔ یہ بات یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مسیحی خانقاہیت کا مزاج بھی اصلاً اور ابتداءً مشنری نہ تھا بلکہ اس کا محور و مرکز اپنی نجات کے لئے سعی کرنا تھا نہ کہ دوسروں کی نجات یا دوسروں کو مسیحیت کی طرف دعوت دینا۔ ملاحظہ کیجیے Ann K.S. Lambton, 'Free Thinking and Individual Freedom' in 'Islam in Modern world' ed. by Syed Ali Ahsan, Dacca, 1964 P. 82, quoted from 'Sufis of Bijapur' P. 155 & n. 48, Kennett scott Latourette, A History of christianity, New york 1975 Vol. I P. 222

۵۸ حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ اپنے ایک مکتوب میں جسے چشتیہ سلسلہ میں "دستور العمل طالبان" کی حیثیت حاصل ہے تحریر فرماتے ہیں: "تا ممکن آں کہ صلح با ہندو و مسلمان سازند و ہر کہ ازیں دو فرقہ کہ اعتقاد بشما داشتہ باشد ذکر و فکر و مراقبہ و تعلیم او بگویند کہ ذکر بخاصیت خود او را بربقہ اسلام خواہد کشید و با غیر معتقد اگرچہ سید زادہ باشد تعلیم نباید کرد کہ رابطہ مبنی بر اعتقاد است"، یعنی یہ کہ ہندو و مسلمان دونوں سے صلح رکھی جائے اور ان دونوں فرقوں میں سے جو بھی تم سے اعتقاد رکھتا ہو اس کو ذکر و فکر، مراقبہ وغیرہ کی تعلیم دینی چاہیے۔ ذکر اپنی خاصیت سے اسے دائرۂ اسلام میں کھینچ لے گا۔ البتہ جو اعتقاد نہ رکھتا ہو وہ چاہے سید زادہ ہی کیوں نہ ہو اسے تعلیم نہیں دینی چاہیے کیونکہ رابطہ کی بنیاد اعتقاد ہے۔ ملاحظہ کیجیے "تاریخ مشائخ چشت" ادارہ ادبیات دلّی، ۱۹۸۴ء، حصہ پنجم ص ۱۲۱۰۔ اس خط کے سلسلے میں تعارفی کلمات کے لیے دیکھیے ص ۱۱۶۰۔

۹؎ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے امیر حسن سنجری، فوائد الفواد، تصحیح محمد لطیف ملک، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ص ۲۱۰، ۲۲۷ — ۲۲۸؛ حمید قلندر، خیر المجالس، تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ص ص ۵۴، ۵۵، ۸۶ - ۸۷، ۱۹۱ - ۱۹۲، ۲۰۸، ۲۶۹؛ مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبع نول کشور جلد اول، ص ص ۲۵۴، ۲۵۸، ۲۵۸ - ۲۶۲؛ آب کوثر، ص ۲۸۳۔

۱۰؎ ملاحظہ کیجئے نجیب العقیقی، المستشرقون، دار المعارف بمصر، ۱۹۶۵ء، الجزء الثانی، ص ص ۵۰۴ - ۵۰۵ مصنف نے پروفیسر آرنلڈ کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا اندازہ ان چند جملوں سے لگایا جاسکتا ہے: "وکان معجبا بالاسلام، متضلعا من علومه، منصفا له فی ابحاثه عنه، فلم تعد علیه هفوة واحدة علی کل ما کتبه عنه فی دائرة المعارف الاسلامیة... فعدّ مرجعا فی الدراسات الاسلامیه"۔

۱۱؎ Sir H.M. Elliot, The History of India as told by its own Historians, ed by prof. John Dowsan, Kitab Mahal, Allahabad vol. I Introduction PP. XXII — XXIII

۱۲؎ ملاحظہ کیجئے Norman Daniel, Islam and West, the making of an image, Edinburgh university press 1980

اس زمانے میں جو کتابیں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں لکھی جارہی تھیں انھیں میں ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شامل ہے جو چار جلدوں میں چھپی تھی۔ اس کتاب کے محتویات کا اندازہ لگانے کے لیے ہم سرسید کا ایک خط بنام نواب محسن الملک نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اسی زمانہ میں لکھا تھا۔ لکھتے ہیں: "ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں لکھی ہے اس کو دیکھ رہا ہوں، اس نے دل جلا دیا اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا..."

دیکھئے خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۳۸؛ نیز دیکھئے مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۱۔

۱۳؎ اس احساس جراحت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال کے ایک برطانوی نقطہ نظر سے کئے گئے تجزیہ کے لیے ملاحظہ کیجئے Hunter, W.W., Indian Musalmans Delhi 1969

۱۴؎ Sufis of Bijapur PP. 155-56 & Nos 49,50

۱۵؎ K.A. Nizami, Life and times of Shaikh Fariduddin Ganj-e-Shakar, Aligarh P. 105

نیز دیکھئے پروفیسر خلیق احمد نظامی، اوراق مصور، عہد وسطی کی دلی، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، ص ص ۴۶، ۵۱-۵۲

۱۶ Aziz Ahmad, Studies in Islamic culture in the Indian Environment, Oxford, 1964, P. 83

۱۷ Sufis of Bijapur PP. 155-56, Aziz Ahmad, P. 141

۱۸ تاریخ مشائخ چشت، جلد اول، ص ۳۸۳؛ اوراق مصور، ص ص ۵۱-۵۲

۱۹ اوراق مصور، ص ص ۵۱-۵۲ ۲۰ مکتوبات قدوسیہ، مطبع احمدی، دہلی، ص ۳۰۵

۲۱ نافع السالکین، ص ۱۷۶، ماخوذ از تاریخ مشائخ چشت، حصہ اول، ص ۳۸۳؛ آب کوثر، ص ۲۱۷

۲۲ K. A. Nizami, some aspects of religion and politics in India during the 13th century, Idarah-e-Adabiyat-e-Delhi 1974 PP. 128, 29; آب کوثر، ص ۲۸۹

۲۳ نفس مصدر، ص ص ۲۳۹ — ۲۴۰ ۲۴ نفس مصدر ص ص ۳۱۸ - ۳۱۹

۲۵ پروفیسر خلیق احمد نظامی، سماجی یک جہتی میں صوفی سنتوں کا رول، ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، جنوری ۸۲ء ص ۳۶- (۲۵ الف) اوراق مصور، ص ص ۱۰۲ - ۱۰۳؛ عزیز احمد، ص ص ۱۳۸ - ۱۳۹

۲۶ نفس مصدر، ص ۳۵ ۲۷ نفس مصدر، ص ۳۵ ۲۸ نفس مصدر ص ۳۶

سم آسپکٹس آف ریلیجن اینڈ پالٹکس، ص ۳۱۸ آخرالذکر کتاب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں "یہ ان کا پختہ یقین تھا کہ روحانی فضیلت مسلمانوں کی طرح ہندو بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

۲۹ I. H. Quraishi, The Muslim community of Indo-Pak subcontinent, the Haque, 1962, PP. 64-65; Aziz Ahmad P. 134

۳۰ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، لکھنو، ۱۹۷۸، حصہ سوم، ص ۱۵

۳۱ نفس مصدر، ص ۲۲ ۳۲ نفس مصدر ص ۳۹

۳۳ سید محمد بن مبارک علوی کرمانی، سیرالاولیاء، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، لاہور ۱۹۷۸، ص ۵۵

۳۴ نفس مصدر ص ۵۷ ۳۵ فوائد الفواد، ص ص ۷۶، ۳۴۶، ۴۰۵

۳۶ تاریخ مشائخ چشت، حصہ اول، ص ۱۹۹؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، (جدید) جلد ۲ ص ۵۰ نیز دیکھئے سم آسپکٹس آف ریلیجن اینڈ پالیٹکس، ص ۱۸۴، اخبار الاخیار سے بھی اسی بیان کی تائید ہوتی ہے دیکھئے ص ۲۲ (مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۴ء)

۳۷؎ سیر الاولیاء، ص ۵۷۔ حضرت خواجہؒ کے سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے ص ص ۵۵-۵۸

۳۸؎ Saiyyed Athar Abbas Rizvi, A History of sufism in India
Delhi, 1978, vol. I, P. 117. n. 2. نیز دیکھئے خزینۃ الاصفیاء، جلد ا، ص ص ۲۵۹-۲۶۳

۳۹؎ کسی قدر تفصیل کے لیے دیکھئے وحید احمد مسعود، ص ص ۱۳۹-۱۴۷، آب کوثر، ص ص ۲۲۶-۲۲۷؛ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ سوم ص ص ۲۵-۲۷ اشتیاق حسین قریشی، ص ۶۴

۴۰؎ حامد بن فضل اللہ جمالی، سیر العارفین، اردو ترجمہ محمد ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۶، ص ۱۲؛ تاریخ فرشتہ، نول کشور، جلد دوم، ص ۳۷۷ ۴۱؎ سیر العارفین، ص ۱۴

۴۲؎ عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، تصحیح مولوی احمد علی، کلکتہ ۱۸۶۸ء، جلد اول، ص ۵۰

۴۳؎ تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۳۷۷ ۴۴؎ سیر الاولیاء، ص ۶۴

۴۵؎ سیر الاولیاء ص ص ۶۴-۶۵ ۴۶؎ عزیز احمد، ص ۵۴

۴۷؎ Life and Times of Fariduddin Ganj-i-Shakar, PP; 107-109; Some Aspects of Religion and politics P. 321; Preaching of Islam P. 231, آب کوثر ص ۲۵۱

۴۸؎ آب کوثر، ص ۲۸۳ ۴۹؎ فوائد الفواد، ص ص ۴۰۴-۴۰۵

۵۰؎ فوائد الفواد ص ۴۱۷-۴۱۸ ۵۱؎ فوائد الفواد ص ص ۵۹-۶۰ ۵۲؎ خیر المجالس ۵۹-۶۰

۵۳؎ آب کوثر، ص ۲۸۱ ۵۴؎ آب کوثر، ص ۲۸۱ حاشیہ نمبر ۱ ۵۵؎ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ص ص ۳۹۴-۳۹۵ ۵۶؎ یحیی سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ص ۹۵

۵۷؎ پروفیسر محمد حبیب، حضرت نظام الدین اولیاء؛ حیات اور تعلیمات، دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۲ء، ص ص ۱۷۶-۱۷۸

۵۸؎ فوائد الفواد، ص ۳۰۵ - ص ۳۰۶ ۵۹؎ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، تصحیح سید احمد خاں، کلکتہ، ۱۸۶۲، ص ۳۴۳-۳۴۴

۶۰؎ فوائد الفواد، ص ۳۰۶ ۶۱؎ آب کوثر، ص ۲۸۵ ۶۲؎ آب کوثر، ص ۲۸۵

۶۳؎ ملاحظہ کیجئے راقم سطور کا مضمون، مشائخ چشت اور حکومت وقت باہمی روابط کا تجزیہ، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-اکتوبر ۱۹۸۳ء، ص ص ۳۲-۵۰ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۳۳۸، ۳۸۶؛ نیز ملاحظہ کیجئے پروفیسر خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ادارہ ادبیات دہلی، ۱۹۸۱، ص ص ۲۱۹-۲۲۴

۶۴؎ تاریخ فیروز شاہی، ص ص ۴۶۰، ۵۰۶، ۵۲۲ ۶۵؎ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ص ۳۷۶-۳۸۰

۶۶؎ سیر الاولیاء، ص ۲۰۶ ۶۷؎ دیکھئے اوراق مصور، ص ۴۶ ۶۸؎ تاریخ مبارک شاہی، ص ص ۹۸-۹۹

۶۹؎ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۳۶۰-۳۶۲ ۷۰؎ سیر الاولیاء ص ۲۳۸ ۷۱؎ آب کوثر ص ۲۱۳

ہماری کتابیں

۱۔ "جوامع الکلم" ملفوظات سید محمد گیسودراز حسینی گلبرگہ		قیمت
	مولوی حافظ سید محمد علی حسینی مولوی کامل نظامیہ	10/-
۲) استعانت بالاولیاء	"	2/-
۳) قادیانی ہی کافر کیوں	"	15/-
۴) اہل سنت والجماعت کی حقیقت	"	5/-
۵) میلاد کی حقیقت	"	3/-
۶) عذاب برزخ	مولانا سعو الدین عثمانی	5/-
۷) یہ مزار یہ میلے	"	5/-
۸) ملت اسلامیہ کی تاریخ حصہ اول	میر محمود علی قیصر	20/-
۹) فتی العرب (اردو عرب کا شجاع) "شہادت حسینؓ سے متعلق مشہور عالم کتاب"		2/-
۱۰) البریلویہ (بریلوی فرقہ کے افکار و اعتقادات) حکومت سعودی عرب کی کتاب کا ایک باب		1/-
۱۱) مروجہ صلواۃ وسلام کی شرعی حقیقت		1/-
۱۲) عرس کے متعلق جامعۂ نظامیہ کا مستحسن فتویٰ		1/-

انجمن تحفظ ناموس صحابہؓ مومن پورہ گلبرگہ